منیر نیازی کی کتابوں کے ناموں کا عصری جواز

ڈاکٹر فرحت جبیں ورک*

Abstract:

The political history written in the books is the history and politics of rulers and the governments. The literature, on the other hand, is the history of the masses. It is the narrative of what the politics of the rulers does with the public at large. The poetry is affected by the political maneuvering and demonstrates ups and downs of every era. Munir Niazi's poetry emerged from social and political issues. He represents, through his poetry and aesthetics, the masses that are affected by the circumstances resulting out of political factors. His poetry is political history of the common man of his era through which one sees the history of Pakistan from independence to the early period of 21st century. Even a decade after his death, his words fit squarely into the current circumstances the country and the common man is going through.

بیسویں صدی میں فرد کی اہمیت کے ساتھ ملکی معاملات میں لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ اب حکومت کرنا صرف مخصوص طبقات کا ہی نہیں بلکہ تمام لوگوں کا یکساں حق متصور ہونے لگا۔ سماجی شعور کی بیداری کے لیے شعراء و ادباء کی بھی قلمی کاوشیں تھیں۔ ان حالات میں جو سیاسی شاعری سامنے آئی اس کا لب و لہجہ خاصا تند و تیز تھا۔ بقول ڈاکٹر سعادت سعید:

''۱۹۴۷ء کے بعد سے لے کر آج تک پاکستانی شاعروں نے جو کچھ دیکھا اور جو سُنا

* صدر شعبہ اُردو، فاطمہ جناح وویمن یونیورسٹی، راولپنڈی

اُسے افسانہ نہیں سمجھا حقیقت جانا اور اُسے لکھا۔ انھوں نے دفاعِ وطن کے گیت گائے، انسانی عظمت کی بحالی کے خواب دیکھے، سماجی سیٹ اَپ کو بدلنے کے لیے قلمی کوششیں بھی کیں، اقتصادی ناہمواریوں کے خاتمے کے لیے شور مچایا، آزاد اور تازہ ثقافت کی تشکیل کی تمناؤں کا اظہار کیا۔ شکستِ ذات سے لے کر شکستِ تمنا تک انھوں نے کئی قسموں کی شکستوں کا سامنا کیا۔''(۱)

قیامِ پاکستان کی صورت میں کئی خواب آنکھوں میں سجانے والوں میں سے ایک خوبصورت شاعر منیر نیازی بھی تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد گو وہ سارے خواب تو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے جن خوابوں کے پھول چنتے ہوئے منیر نیازی نہ جانے کتنی منازل طے کر آئے تھے لیکن جو کچھ حسرتیں پوری ہوئیں بھی تو اتنی دیر سے کہ نہ تو دل میں ارمان باقی رہے اور نہ نظروں میں شوق۔ یہ وہ دور تھا جب عدم مساوات، عدم تحفظ کا خوف، تنہائی کی اذیت، قربانیوں کے رائیگاں جانے کا دُکھ، کارواں سے بچھڑ جانے کا درد، تنہائیوں کا زہر اور احساسِ رائیگانی اُن کی شاعری میں سارے کا سارا رچ بس گیا تھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد شعراء نے واعظ ہی نہیں عاشق، رند، رومانی باغی، مبلغ، مجاہد، انقلابی اور اشترا کی سب کے نسب نامے کو پھر سے ایک بار آدم کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے اور آدمی کے چہرے سے اس کا اوپری خول اتار کر اُس کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے میں منیر نیازی نے اُن بھیڑیا صفت آدمیوں کی نشاندہی کا کارنامہ سرانجام دیا جو سیاسی منظر نامے کو اپنی گھناؤنی اور آسیب زدہ صورت سے داغدار بناتے چلے جا رہے تھے۔ ایسے میں غزل کی دُنیا میں بھی نمایاں تبدیلی نمودار ہوئی اور عشق و حُسن کے موضوعات کے ساتھ ساتھ دیگر معاشرتی رویے استعارے و علامت کی صورت میں جگہ پانے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب پوری پاک سرزمین داخلی اور محسوساتی سطح پر بکھرنا شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی اُس دور کی افراتفری اور غزل کی موضوعاتی کشادہ دامنی کو یوں بیان کرتے ہیں:

''۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک اور ۱۹۵۸ء سے صدر ایوب کی بے دخلی تک سیاسی تجربات کینا کامی، شخصی آزادی کی متاعِ گراں بہا کی بے حرمتی، عدم تحفظ، عدم توازن، عدم تشخص نے خرابہ دل کو کچھ اور بھی ویران کر دیا۔ جدید اُردو غزل اِسی خرابے کی مکین ہے۔ اس صورتحال نے تجریدی رویے کو فروغ دیا۔ غزل کا اشاراتی اور کنایاتی لہجہ ہی نہیں بدلا۔ پوری داخلی فضا بھی بدل گئی۔ غزل کی دُنیا خوف و ہراس کی دُنیا تھی۔ اب غزل کی فضا نہ وسط ایشیائی تھی نہ مقامی، اس کی بجائے غزل ایک اُجڑے دیار کی ترجمان تھی جہاں امن و سکون ناپید ہے۔ جہاں ہوائیں خوف زدہ کرتی ہیں۔ جہاں

چڑیلیں آباد ہیں، جہاں انسان کی ذات دولخت ہے۔ جہاں فرد اپنی ذات اور اپنے اوصاف کے درمیانی رشتے بھی گنوا بیٹھا ہے۔ جہاں انسان اور اُس کا سایہ ایک دوسرے سے جُدا جُدا زندگی کے سفر پر روانہ ہیں۔ جہاں زندگی کی معنویت پورے عروج پر ہے۔ جہاں ویرانی ہے، سناٹا ہے، بھوت پریت ہیں اور انسان بے یارومددگار فاسفورس کے ہیولوں کی شکل میں حیات وکائنات کے قبرستان میں اپنے لمبے لمبے بازو اٹھائے فاتحہ خوانی کر رہا ہے۔''(۲)

منیر نیازی کی شاعری اور خاص طور پر غزل کا سفر طلسمات کی دُنیا کا سفر ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں نے زندگی کو سیدھے اور سادے انداز میں قبول نہیں کیا بلکہ منیر نیازی کی غزل میں انسان کی بے حسی کا نوحہ، بھٹکتی ہوئی روحوں کا رقص، خالق ومخلوق کے رشتے، قرب و بعد کی مسافتیں، اجاڑ پن کا احساس، جہد مسلسل کی لاحاصلی، فکر کی پسپائی، شخصیت کی شکست و ریخت یہ سب دیکھا جائے تو حکمرانوں کی لاپرواہیوں اور عوام سے رہنماؤں کے غیر مساویانہ رویوں سے درآیا ہے۔ منیر نیازی کی شاعری سیاسی حالات وواقعات کو خوف اور بے حسی، احساس محرومی اور ذات کے ریزہ ریزہ ہونے کے ڈر جیسے احساسات میں سمیٹے ۱۹۵۸ء سے ۲۰۰۴ء تک کا سفر طے کرتی ہے۔ وہ ایک مکمل سیاسی شاعر نہ تھے مگر سیاسی رویوں نے جو کچھ معاشرے کی جھولی میں ڈالا اُس کی بنا پر منیر نیازی کی شاعری آسیب زدہ سرزمین کا بھیانک احساس بھی دلاتی ہے۔ ان حالات میں شعراء نے انسانوں سمیت مظاہر فطرت پر بھی اُداسی و بے بسی کے اثرات کو دکھاتے ہوئے اُس وقت کا نوحہ رقم کیا۔ شعراء نے جُھلسے پیڑ، جلی آبادیاں، اُجڑے چمن، سنسان گلیاں، شہروں کے سُونے کھنڈروں، قفس، ڈوبتے سورج اور اندھیرے میں کھوئے ہوئے ساحلوں کے ذریعے اُس وقت کی داستان کو رقم کرنا شروع کیا۔ ایسے میں منیر نیازی کی نظم ''زندگی'' ۱۹۵۵ء میں منظرِ عام پر آئی:

دیکھتی آنکھوں اُفق کے سرد ساحل پر اندھیرا چھائے گا
ڈوبتا سُورج کسی بُھولے سمے کی داستاں بن جائے گا (۳)

یہ وہ دور تھا کہ جب منیر نیازی سمیت دیگر اُردو شعرا نے اُس آزمائش میں قوم کی فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ ۱۹۵۹ء میں منیر نیازی کا پہلا مجموعہ کلام ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اِس میں مختلف اشعار سے ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء تک کی صورتحال کا اندازہ ہوتا ہے جیسے مندرجہ ذیل اشعار سے ہجرت اور فسادات کی خون آشام گھڑیاں یاد آجاتی ہیں۔

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

(تیز ہوا اور تنہا پھول، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۶۹)

ے صبح کاذِب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

(تیز ہوا اور تنہا پھول، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۹۹)

بقول ڈاکٹر سرورالہدیٰ: ''منیر نیازی سفر میں اسباب کے لوٹنے کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاں سفر کا خوف اور زیاں کا احساس بہت غالب ہے''۔(۴) ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء تک دس سال جبر اور خاموشی کا دور تھا۔ اِس دوران فاطمہ جناح کا قتل، ۱۹۶۵ء کی جنگ اور اُس کے بعد بھی مسلسل مارشل لاء نے ایک عجب بے یقینی کی فضا پیدا کر دی۔ پروفیسر عملدار حسین بخاری، اُس دور کی صورتحال کو یوں بیان کرتے ہیں:

> اِسی دوران میں ۱۹۶۵ء میں بھارت کے ساتھ جنگ ایک اور موقع تھا۔ جب قوم اپنے اصل تشخص Discover کر سکتی تھی کیوں کہ اس مختصر عرصے میں قوم نے اپنے بہت سے مستقل رویوں اور عادتوں میں تبدیل کر لی تھی اور قربانی واعتماد اور جدوجہد کا بے انتہا ولولہ پورے ملک میں نظر آیا، اس وقت یوں لگتا تھا کہ پوری قوم کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے ہیں لیکن یہ سنہری موقع بھی جھوٹ کے نظام کی نذر ہو گیا۔(۵)

منیر نیازی کے پہلے مجموعے کے علاوہ دو اور مجموعے جنگل میں دھنک (۱۹۶۳ء) اور دشمنوں کے درمیاں شام (۱۹۶۸ء) بھی منظر عام پر آئے۔ اس دور کی شاعری خاص طور پر نظم لکھنے والوں نے اسلوب کے تجربوں کی شکل میں نئے نئے اضافے کئے۔ مصرعوں کی توڑ پھوڑ علامتوں کی بازی گری دکھائی۔ دھیمے پن کو معیوب سمجھ کر ردّ کیا گیا جیسے منیر نیازی کی درج ذیل نظم اِس کی عمدہ مثال ہے:

ے پھیلتی ہے شام دیکھ ڈوبتا ہے دن عجب
آسماں پہ رنگ دیکھو ہو گیا کیسا، غضب

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۸۸)

منیر نیازی کے مجموعہ ہائے کلام کے ناموں پر غور کیا جائے تو اُس دور کے حالات وواقعات کی بھرپور عکاسی ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ تیز ہوا اور تنہا پھول، شاعر خود بھی ہے اور شاید قائداعظمؒ کی بے لوث اور مخلص ذات بھی ہے۔ اب دوسرے مجموعہ کلام میں مارشل لاء کی وجہ سے مُلک جنگل کا سماں پیش کر رہا ہے اور دھنک ''جنگل'' میں انسانی زندگیوں کی کچھ رمق ہے جو اس دیس میں رُک کر انتظار کرنے اور حالات بدلنے کی اُمید لئے ہوئے ہے۔ تبھی تو شاعر کہتا ہے کہ:

ے بھاگ کر جائیں کہاں اِس دیس سے اب اے منیر
دل بندھا ہے پریم کی سُندر، سجیلی ڈور سے

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۳۱)

جیسا کہ ۱۹۶۸ء میں منظر عام پر آنے والے اُن کے مجموعہ کلام ''دشمنوں کے درمیان شام'' کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ بیرونی دشمن سے زیادہ اندرونی دشمن عناصر کی طرف زیادہ توجہ دلاتے ہیں کہ جو مُلک میں جمہوریت کو پنپنے نہیں دینا چاہتے اور جس کی بنا پر سیاسی فضا پر ایک عجب سا حزن وملال طاری دکھائی دیتا ہے۔

اُس دور کو جبکہ جمہوریت ناپید ہو چکی تھی، ''زوالِ عصر'' کہنا بے جا نہ تھا اور حکمراں جو کہ کُرسی کے لالچ میں انانیت پرست ہو کر اب مُلک میں ''کوفے'' کا سا سماں پیدا کئے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں خدا سے التجاؤں اور ناخداؤں کے سامنے گداگر بننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ منیر نیازی نے ایسے دور کے بارے میں کہا تھا:

ے زوالِ عصر ہے کوفے میں اور گداگر ہیں
کُھلا نہیں کوئی دَر بابِ التجا کے سوا

(دشمنوں کے درمیان شام، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۳۵)

جس کے نتیجہ میں ہم آج بھی انتظامی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی بحران کا شکار ہیں۔ اس سنگین بحران کو محسوس کرتے ہوئے منیر نیازی جیسا حساس شاعر اگر یہ کہے تو بے جا نہیں:

ے حَد سے گزر گئی ہے یہاں رسمِ قاہری
اِس دہر کو اب اِس کی سزا دینا چاہیئے

(دشمنوں کے درمیان شام، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۳۲۰)

یہاں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منیر نیازی سمیت ہر باشعور شہری کے گزرنے والے دن اور شامیں اصل میں اپنے پیدا کردہ دشمنوں کے درمیان گزر رہی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں ''رسمِ قاہری'' کی جو بنیاد پڑی وہ منیر نیازی کے آخری مجموعہ کلام ''ایک مسلسل'' کے آنے تک بھی جاری وساری تھی۔

ے منیؔر اِس مُلک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ'' (۶)

منیر نیازی نے اس تمام صورتحال کو ۱۹۷۴ء میں منظرِ عام پر آنے والے اپنے مجموعہ کلام ''ماہِ منیر'' میں رقم کر دیا۔ اس مجموعے میں منیر نیازی کی نظموں کے عنوانات اے ہلالِ عید، اپنے وطن پر سلام، اپنے شہروں کے لیے دُعا، اپنے شہر کے لیے دُعا اور ایک نیا شہر دیکھنے کی آرزو کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اب شاعر سیاست کے بدلتے منظر نامے سے کچھ مطمئن ہے اور جمہوریت کی پروان چڑھتی عمارت میں اُسے کچھ اُمید کی کرن نظر آئی ہے تبھی تو وہ کہتے ہیں:

ے اِک وارث ہمیشہ ہوتا ہے
تخت خالی رہا نہیں کرتا

عہدِ انصاف آرہا ہے منیر
ظلم دائم ہوا نہیں کرتا

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص - ۴۲۳)

ایک عجیب افراتفری و بے یقینی، بے امانی کا دور تھا۔ مارشل لاء، حکومت کی وجہ سے تحریر وتقریر پر پابندی تھی۔اس دور میں جبر کی فضا کے باوجود شعراء نے فگار انگلیوں میں قلم کا علم تھامے رکھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال خاں ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء کی غزل کا جائزہ لیتے ہوئے اسی حقیقت کی یوں نشان دہی کرتے ہیں:

''قیام پاکستان کے گذشتہ تیس سال کے دور میں مسائل زندگی کی روحانی اور مذہبی تعبیر کی جگہ آہستہ آہستہ سیاسی و مادی تفسیر نے لے لی۔ سیاسی احوال وظروف اور افکار و نظریات شعروادب کی غالب روایت فکر بنتے گئے۔اس روپ نے غزل کے لب ولہجہ اور فضا کو بھی متاثر کیا۔ سیاسی بے اطمینانی اور ناآسودہ حالی غزل کے رموز وعلائم میں ڈھلی۔ چنانچہ اس دور کی غزل کی فضا عشقیہ کی بجائے سیاسی اور لہجہ حزینہ، عاجزانہ اور دردمندانہ کے بجائے ترش وتند جارحانہ اور رجزیہ ہے''۔(۷)

۱۹۷۹ء میں منیر نیازی کا مجموعہ کلام ''چھ رنگین دروازے منظر عام پر آیا۔اس میں منیر نیازی نے چھ یعنی شش جہات پر اندھی تیرگی، ایک عام آدمی کے شکوے شکایت کو زبان دی اور شکوہ کرنے کے لئے بھی کسی مناسب آدمی کی عدم دستیابی کی شکایت کی:

شکوہ کریں تو کس سے شکایت کریں تو کیا
اِک رائیگاں عمل کی ریاضت کریں تو کیا

(چھ رنگیں دروازے، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص - ۵۲۵)

منیر نیازی کی غزل ''میری ساری زندگی کو بے ثمر اُس نے کیا'' تو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۹ء تک کی مکمل داستاں ہے کہ پاکستانی عوام ہجرت کے سمے کس قدر کمزور تر تھے مگر راہبر ہمیشہ راہزن نکلے اور عوام کے نام پر ملک کو کمزور سے کمزور تر بناتے چلے گئے۔ پروفیسر عملدار حسین بخاری، منیر نیازی کی اُس دور کی شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں:

''تحریک آزادی، قیامِ پاکستان اور اِس کے بعد سیاسی وسماجی اور اخلاقی انتشار و ابتری، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، بدعہدی، سازش اور جبر کی بنا پر قوم کے حساس وذہین افراد نے یہ محسوس کیا کہ ان کی بے ثمر زندگیوں کے رائیگاں برس محض اِن کے وجود کا بوجھ ہیں۔ان حالات اور کیفیات سے دردوحُزن کے وہ سوتے پھوٹے جنھوں نے

شاعر کے احساسات کو اپنی سخت گرفت میں جکڑ لیا۔''(۸)

یہ وہ حالات تھے کہ جب منیر نیازی کو سفر کی رائیگانی کا احساس شدت سے ہونے لگا اور انھوں نے اُس دور کا عہد نامہ یوں رقم کیا:

ے میری ساری زندگی کو بے ثمر اُس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اُس نے کیا

(چھ رنگیں دروازے، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۵۱۵)

۱۹۷۷ء کا دور وہ دور تھا کہ جب ملک میں نظام مصطفیٰ کے قیام کے مطالبے نے شدت اختیار کر لی اور جنرل ضیاء نے ۱۹۸۰ء میں معیشت، سیاست اور معاشرت سبھی کو۔

اُس دور میں منیر نیازی سمیت ہر حساس شہری نے محسوس کیا کہ یہ وطن عزیز اور اِس میں بسنے والے سادہ لوح عوام کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے کہ وہ ۱۹۴۸ء کے بعد سے بے حس حکمرانوں کو برداشت کرتے رہیں جو ملک کی ترقی وخوشحالی، جمہوریت اور عوام کے سُکھ چین کے بدترین دشمن رہے ہیں اور جو وطن عزیز کی مٹی پر بوجھ ہیں۔

۱۹۸۳ء میں منیر نیازی کا ایک اور مجموعہ کلام ''ساعتِ سیّار'' منظر عام پر آیا یہ وہ دور تھا کہ جس میں منیر نیازی جان گئے تھے کہ ظالم حکمرانوں کے سامنے عوام بھی بے بس ہو گئے اور غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ مسلسل ظلم وستم بالآخر انسان کو بغاوت پر آمادہ کر دیتے ہیں اور اِنسان کو احساس ہوتا ہے کہ اصل میں تو اُس کا شروع سے ہی انتخاب غلط تھا۔

ے تھا منیر آغاز ہی سے راستہ اپنا غلط
اس کا اندازہ سفر کی رائگانی سے ہُوا

(ساعتِ سیّار، مشمولہ کلیات منیر، ص-۶۱۵)

اسی عہدِ جبر میں حساس افراد میں رائیگانی کا احساس شدت اختیار کرتا چلا گیا۔

ے کس محبت سے ہوا تعمیر مدت میں منیر
چند لمحے جس نگر کی خاک اڑانے میں لگے

(ایضاً، ص-۶۱۶)

جمہوریت کا خواب، شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ جیسے جیسے قیامت خیز گھڑیاں بیت رہی تھیں، منزل اور دور ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صفدر محمود کہتے ہیں: ''۱۹۷۷ء میں عوام کی عظمت کو سلام کرنے والے ضیاء الحق نے

۱۹۸۳ء میں کہنا شروع کیا کہ پاکستان کے عوام جمہوریت کے اہل نہیں اور دوسری طرف وہ مختلف حیلوں بہانوں سے انتخابات ملتوی کرتے رہے''۔(۹)

یوں ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آنے والے مجموعہ کلام ''پہلی بات ہی آخری تھی'' کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے جان لیا ہے کہ ۴۸ء کے بعد آنے والی کوئی بھی قیادت ملک اور کم از کم عوام کے حق میں نہیں رہی۔ منیر نیازی کی شاعری کے ہر شعری مجموعے کی طرح اِسے بھی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق کا ادراک تخلیقِ فن کے لمحوں میں خون بن کر رگِ سنگ میں اُترنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ اس مجموعے کی نظم ''اپنے وطن کے لئے'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جس سے قائداعظم کے حوالے سے شاعر کی بات یعنی ''پہلی بات ہی آخری تھی'' سچائی کے منصب پر فائز نظر آتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

ے قائداعظم نے اس کی راہ دکھلائی ہمیں
اِس مقامِ شوق پر اس کی صدا لائی ہمیں

(پہلی بات ہی آخری تھی، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۶۵۵)

تبھی ۱۹۹۱ء میں اُن کا مجموعہ کلام ''ایک دُعا جو میں بُھول گیا تھا'' کے نام سے لوگوں کو پڑھنے کو ملا۔ اس میں اُس متزلزل عہد کی تمام داستاں رقم ہوتی نظر آتی ہے۔ ان حالات میں بھی ایک عاقل و صابر شخص گِلہ نہ کرے تو یہ اُس کے بھی پتھر دل ہونے کی دلیل ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہی تو منیر نیازی اِس درد کو یوں بیاں کرتے ہیں:

ے رہبر کو اُن کے حال کی ہو کس طرح خبر
لوگوں کے درمیان وہ آ کر نہیں رہا

(ایک دُعا جو میں بھُول گیا تھا، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۳۲۷)

۱۹۹۴ء میں منیر نیازی کے دو مجموعے یکے بعد دیگرے ''سفید دن کی ہوا'' اور ''سیاہ شب کا سمندر'' کے نام سے شائع ہوئے۔ اِن مجموعوں کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے شاعر جان چکا ہے کہ حالات کا مثبت سمت میں جانے کا راستہ اب عوام کے لیے سراب اور حکمرانوں کے لئے خواب گراں بن چکا ہے۔ ایک ایسی منزل کا خواب جس کے کبھی شرمندہ تعبیر ہونے کا گماں تھا بھی اب عوام اس سراب آلود خمار سے باہر آ چکی تھی۔ کیونکہ حالات روز بروز بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اسی منظر کے حوالے سے جذبات و احساسات کی عکاسی منیر نیازی یوں کرتے ہیں:

ے ہوئی نجات سفر میں فریب صحرا سے
سراب ختم ہوا اضطراب ختم ہوا

(سفید دِن کی ہوا، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۸۷)

''سیاہ شب کا سمندر'' کی ایک نظم ''کتنا چلتے اور'' میں سیاستدانوں کے سیاسی رویوں سے ملنے والی تھکن اورخواب نہ پورے ہوسکنے کا سلسلہ شاعر کو پریشان کرتا۔۱۹۹۴ء میں منیر نیازی کے منظرِ عام پر آنے والے دوشعری مجموعوں کے بعد۲۰۰۴ء یعنی دس سال تک ایک عجب، بےبسی اور خاموشی طاری رہی۔عام رائے یہ رہی ہے کہ منیر نیازی کے اندر تخلیق کا عمل رُک چکا ہے مگر ان سب سیاسی حالات اور واقعات کو جان لینے کے بعد ایک ذی شعور جان لیتا ہے کہ یہ جمودِ تخلیقی عمل کی کمزوری کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مسلسل رائیگانی کے احساس نے شاعر کو بھی ہونٹ سی لینے اور قلم کی رفتار موقع کی تاک میں سُست کر لینے پر مجبور کر دیا۔۲۰۰۴ء میں منظرِ عام پر آنے والے اُن کے مجموعے ''ایک مسلسل'' کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس مُلک میں فوجی حکمرانوں کا نزول ایک مسلسل کی طرح جاری ہے اور اس مسلسل رائیگانی واحساسِ زیاں میں بات کہنا، ہوا کی نظر کر دینے والی بات رہتی ہے۔اِس مسلسل رائیگانی کے سفر میں جب شاعر یہ محسوس کرے کہ:

کیا مِلا ہم کو جہاں میں دیر تک اِک ساتھ رہنے کا صِلہ
فکرِ آئندہ و رفتہ، حال کے تبدیل ہونے کے سِوا

(ایک مسلسل، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۸۵۱)

اِس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر حرف حرفِ احتجاج کرتے تنگ آ چکا ہے اور ۲۰۰۴ء میں بھی حالات کے جبر سے تنگ آ کر اپنے آپ کو اس قلم کی جنگ میں تنہا بتاتا ہے کہ اب ہر کوئی مفاد پرست ہو چکا ہے۔نئے لوگ متحد ہو کر ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے نظر نہیں آتے۔عجب افراتفری اور زیاں کا دور ہے۔

ایسا سفر ہے جس میں کوئی ہم سفر نہیں
رستہ ہے اِس طرح کا جو دیکھا نہیں ہوا
مشکل ہوا ہے رہنا ہمیں اِس دیار میں
برسوں یہاں رہے ہیں، یہ اپنا نہیں ہوا
وہ کام شاہِ شہر سے یا شہر سے ہُوا
جو کام بھی ہُوا ہے وہ اچھا نہیں ہوا

(ایضاً، ص-۸۵۲)

شاعر اتنا عرصہ خاموش رہنے کے باوجود بھی نا اُمید نہیں ہاں البتہ تھک گیا ہے اور اب مُلک کے لوگوں کے لیے آسانیاں دیکھنا چاہتا ہے۔منیر نیازی جیسا حساس شاعر جانتا ہے کہ ماندگی اور خستگی کا راستہ قوم کو سراسر گمراہی کے راستے پر ڈال رہا ہے۔جس سے قوم بہت سے بُرے اعمال کا شکار ہوتی چلی جائے گی۔ظاہر ہے کہ جب حکمران

ہی جبر کا تاج پہن لیں تو پھر رعایا بھی چور دروازوں کی طرف رُخ پھیر لیتی ہے۔ تبھی تو منیر نیازی سادہ وآساں زندگی کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔

ایک سادہ اور آساں زندگی کا راستہ
اور کچھ دن دیکھتے ہیں، اُس گھڑی کا راستہ
دیر تک چلتے رہے اور چلتے چلتے تھک گئے
ختم ہونے میں نہ آیا گھر ہی کا راستہ

(ایضاً،ص-۸۵۴)

الغرض منیر نیازی کے پہلے مجموعے ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' ۱۹۵۹ء سے شروع ہونے والے اِس شعری سفر کا اختتام یوں تو ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آنے والے آخری مجموعے ''ایک مسلسل'' پر ہوا مگر یہ صرف شعری سفر نہیں بلکہ اِس میں مُلک کی ۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۴ء تک کی سیاسی تاریخ، حکمرانوں کی خودغرضی، عوام کی اکثریت کی بے حسی اور غفلت کی مکمل تاریخ ہے۔ اِس سیاسی حالات و وقوعات کی مکمل داستاں ۲۰۰۴ء کے بعد بھی آج ہی کا منظر نامہ معلوم ہوتا ہے۔ منیر نیازی کی بات ''بُرا وقت ہے ہم پر'' آج بھی تروتازہ حالات میں زندہ وجاوید نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ''پاکستانی اُردو غزل مشمولہ اردو غزل''، مرتبہ: ڈاکٹر کامل قریشی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۸۲

۲۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ''اردو غزل کی نئی روایت مشمولہ جدیدیت کی تلاش میں''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۸۰،۳۸۱

۳۔ منیر نیازی، نظم: زندگی مشمولہ ادب لطیف، سالنامہ، لاہور، جلد: ۳۹، شمارہ: ۵، مارچ، ۱۹۵۵ء، ص ۲۴۱

۴۔ سرورالہدیٰ، ڈاکٹر، مضمون: منیر نیازی کی غزل مشمولہ روشنائی، کراچی، شمارہ: ۲۸-۲۹، جنوری-جون ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۴

۵۔ عملدار حسین بخاری، پروفیسر، مضمون: نئی شاعری اور آشوب عصر مشمولہ نگار، کراچی، شمارہ: ۹، ستمبر، ۱۹۸۳ء، ص ۲۶، ۲۷

۶۔ منیر نیازی، غزل مشمولہ فنون، لاہور، جلد: ۸، شمارہ: ۳-۴، جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۰۹

۷۔ محمد اقبال احمد خان، ڈاکٹر، ''انتخاب غزل ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۹ء''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۴۰۶

۸۔ عملدار حسین بخاری، پروفیسر، مضمون: نئی شاعری اور آشوب عصر مشمولہ نگار، کراچی، شمارہ: ۹، ستمبر، ۱۹۸۳ء، ص ۲۶

۹۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، ''جمہوریت کا سفر اور اس کا حشر مشمولہ پاکستان: تاریخ وسیاست ۱۹۴۷-۸۸''، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۹۳